اُردُو کا نقّاد شاعر

فراق گورکھپوری

حالات و اِنتخاب

لاہور راولپنڈی منگلا پشاور حیدرآباد کراچی
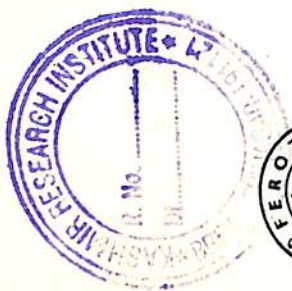
باردوم ———— ۱۹۶۸

تعداد ———— دو ہزار

مطبوعہ ———— فیروز سنز لمیٹڈ۔ لاہور

طابع ———— عبدالحمید خان

قیمت ———— ۵۵ پیسے

دیباچہ

اُردُو کے مشہور شاعروں کے حالات اور انتخابِ کلام پر مشتمل کتابچوں کا یہ سلسلہ اُردُو ادب کے اُن شائقین کے لیے مرتّب کیا گیا ہے جن کی عدیم الفرصتی ضخیم کتابوں کی متحمّل نہیں ہو سکتی۔

زیرِ نظر کتابچے میں اُردُو کے نقّاد شاعر فراق گورکھپوری کے حالات اور منتخب کلام دیا گیا ہے۔ جو مختصر ہونے کے علاوہ سوانح، تنقید اور انتخاب کے لحاظ سے جامع بھی ہے۔ مُبہم اور مُشکل اشعار نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ اور صرف وہی شعر منتخب کیے گئے ہیں جو نہ صرف عام فہم ہیں بلکہ شاعر کو اس کے حقیقی رنگ میں بھی پیش کرتے ہیں۔

فراق کے علاوہ اُردُو کے ۱۹ دیگر قدیم و جدید

شعرا کے حالات و انتخاب کلام بھی پاکٹ بک سیریز
میں شامل کیے گئے ہیں۔

ناشرین

حالاتِ زندگی

1896

رگھوپتی سہائے نام، فراقؔ تخلّص۔ ۱۸۹۶ء میں اپنے آبائی وطن گورکھ پور میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک معزّز سری واستو کائستھ خاندان کے فرد ہیں۔ چونکہ ان کے بزرگوں کو عہدِ شیر شاہ سوری میں پانچ گاؤں ضلع گورکھ پور میں ملے تھے اس لیے خاندان کے لوگ پنج گانواں کے کائستھ مشہور ہوئے۔

فراقؔ کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرتؔ اردو و فارسی کے اچھے عالم تھے اور ایک ممتاز و معروف وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ اچھّے شاعر بھی تھے۔ فراقؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر اردو سے شروع ہوئی۔ سات سال کی عمر میں انگریزی تعلیم کے لیے سکول میں داخل کیے گئے۔ جہاں ان کی خدا داد ذہانت کے جوہر کھلے اور انھوں نے ہر امتحان میں امتیازی

کامیابی حاصل کی۔ میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی اے
پاس کر لیا تو گورنمنٹ نے آئی، سی، ایس کے
لیے انھیں نامزد کر دیا۔ لیکن ان ایّام میں وہ اپنی
ازدواجی زندگی کی تلخی سے کچھ اِس طرح بیدل ہو رہے
تھے کہ ڈپٹی کلکٹری قبول کرنے کے بجائے کانگریس میں
شریک ہو کر خدمتِ قوم و وطن میں پناہ لینا چاہی۔ جس
کا نتیجہ یہ ہُوا کہ انھیں اسیرِ فرنگ ہونا پڑا۔ ۱۹۲۷ء
میں جب وہ قید سے رہا ہو کر آئے تو کرسچین کالج
لکھنؤ میں مُلازم ہو گئے۔ پھر سناتن دھرم کالج کانپور
میں اُردُو کے لیکچرار مقرّر ہُوئے۔ اس دَوران میں
انھوں نے انگریزی میں ایم۔ اے کر لیا اور الہ آباد
یونیورسٹی میں انگریزی کے لیکچرار ہو گئے۔ جب سے
آپ کا قیام مستقلاً الہٰ آباد ہی میں ہے۔ اور آپ
اپنے فرائضِ منصبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ اُردُو
شعروادب کی گراں قدر خدمت بھی کر رہے ہیں۔
فراقؔ کی طبیعت بچپن ہی میں شعر و شاعری کی
طرف مائل تھی لیکن چونکہ آپ کے بعض مصالح

کی بنا پر ان کے اس ذوق کو زیادہ ابھرنے نہ دیا۔ تاہم ان کی مساعی اس معاملے میں پوری کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ چنانچہ فراق اپنے پھوپھی زاد بھائی راج کشور لال سحر شاگرد امیر مینائی کی صحبتوں میں شاعرانہ کیفیات سے اس درجہ مانوس ہوئے کہ آخر لطفِ سخن ان کا جزوِ زندگی بن کر رہا۔

۱۹۱۶ء میں انھوں نے پہلی غزل کہی اور حضرت ناصری مرحوم سے اصلاح لی۔ کچھ دنوں بعد وسیم خیرآبادی سے اصلاح کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس زمانے میں بی۔اے کرنے کے بعد وہ قید ہوئے تو وہاں مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمّد علی جوہر وغیرہ کی صحبتیں نصیب ہوئیں اور بقول شخصے قید خانہ فراق کے لیے شعر و سخن کا مدرسہ بن گیا۔ اس مدرسے سے فارغ ہو کر نکلے تو پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

حضرت فراق کی ابتدائی غزلوں میں امیر مینائی کا رنگ جھلکتا ہے جو ان کے بھائی سحر کے توسط

سے اُن تک پہنچا۔ پھر عزیز اور صفی کا رنگ اُن کے
ہاں اُبھرتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ میر کے رنگ
میں کھونے لگتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اِن اساتذہ کے
تاثرات، دیگر شعرائے اُردو کے گہرے مطالعے اور
انگریزی ادب کی وافر معلومات سے اثر پذیر ہو کر
فراق بھی ایک نئے رنگ کی تخلیق کرنے لگے۔ جسے
ہم خود فراق کا طرزِ سخن کہہ سکتے ہیں۔ اُن کے تغزل
کا مرکزی عنصر عشقیہ اور عام زندگی کے متعلّق ایک
وجدانی ادراک ہے۔ اسی کی بدولت ان کے یہاں
جذبات نگاری کے بجائے ہمیں تنقیدِ حیات کا پہلو
زیادہ اُجاگر نظر آتا ہے۔ فراق نے غزل کو ایک نئی
تاثیر، ایک نئے شعور اور ایک نئے آہنگ سے
ہم آہنگ کیا ہے۔ اُن کے تصوّر میں ہمیں قلب و نظر،
سکون و توازن، نرمی و محبّت اور خیر و برکت سبھی
کچھ ملتا ہے۔ وہ جنسی عشق کو اُس کی تمام نزاکتوں،
لطافتوں اور بلندیوں کے ساتھ جس رچے ہوئے
رنگ میں بیان کرتے ہیں وہ اُنھی کا حصہ ہے لیکن

ان تمام محاسن کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ فراقؔ کے ہاں ابہام بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ چونکہ مختلف اور بظاہر بے تعلّق چیزوں میں ایک رشتہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے خیال کے حسین ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی پوری وضاحت نہیں کر پاتے۔

اس میں شک نہیں کہ فراقؔ غزل گو شاعر ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ غزل کے علاوہ کچھ اور کہتے ہی نہیں۔ یا اُن کی دُوسری شعری کاوشیں لائقِ اعتنا نہیں۔ فراقؔ کی نظمیں اور رُباعیاں بھی ادبی حلقوں میں خاصی مقبول ہو چکی ہیں۔ ان کی نظموں میں طرزِ بیان کا تنوّع اور اسلوب کی رنگا رنگی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کے علاوہ وہ چونکہ فطری طور پر مناظرِ فطرت سے بہت ہی شدید قسم کا تاثّر قبول کرنے کے عادی ہیں۔ اس لیے اُن کی منظریہ شاعری میں مناظر کے خد و خال کے ساتھ ساتھ اُس کی بھرپور

فضا بھی ملتی ہے۔ اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے

جو فراق کی منظومات کو بہت ہی پُر تاثیر بنا دیتی ہے۔ اِن نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی وہ نظمیں بھی قابلِ ذکر ہیں جن میں انھوں نے بڑی بے باکی مگر دِل کشی کے ساتھ داستانِ آدم سُنائی ہے۔ فراق کی ایسی نظمیں بہت نازک اور بلیغ اشاریت کی حامل ہیں اور اُن میں شاعر کا بیدار سیاسی شعور صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔

جہاں تک فراق کی رُباعیوں کا تعلّق ہے، نیاز فتحپوری کی مختصر مگر جامع رائے بڑی معنی خیز ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"فراق نے اس صنفِ سخن میں لطیف ترین بُت گری سے کام لیا ہے۔ ان رُباعیوں میں مغربی کلچر بھی ہے اور ایرانی کلچر بھی۔ یونانیوں کا جمالیاتی نظریہ بھی اُن میں موجود ہے اور قدیم ہندو اور بودھ آرٹ کا رقص و نغمہ بھی۔"

اور یہی وجہ ہے کہ فراق کی رُباعیات کا مجموعہ

"رُوپ" اُردُو دان طبقے میں بڑی قدر و منزلت اور محبّت کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔ فراق کے اِس مجمُوعے کی تمام رُباعیاں جمالیاتی ہیں۔ لیکن اُنھوں نے ہمارے جنسی جذبے کو جس تہذیب کے ساتھ ایک آفاقی کلچر کا رنگ دے کر پیش کیا ہے وہ یقیناً لائقِ صد ستائش ہے۔
بحیثیتِ مجموعی فراق عصرِ حاضر کے ممتاز شعراء میں سے ہیں۔ اُن کی شاعری میں ہمیں سب سے زیادہ تنقیدِ حیات کی ایک مُسلسل کوشش ملتی ہے۔ اور شاید اِسی لیے انھیں عام طور پر اُردُو کا نقّاد شاعر کہا جاتا ہے۔

فراق ستّر کے پیٹے میں ہیں۔ لیکن ان کا فن ابھی تک جوان ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ جُوں جُوں عُمر گُزر رہی ہے ان کی فکر جوان ہوتی جا رہی ہے۔

اُن کے کلام کے کئی مجمُوعے شائع ہو چکے ہیں۔

جن میں "رمز و کنایات" اور "شبنمستان" صرف

غزلوں اور "روپ" محض رُباعیات کے مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ "رُوحِ کائنات" اُن کی نظموں اور غزلوں اور "مشعل" غزلوں اور رُباعیوں کے مجموعے ہیں۔

انتخابِ کلام

جہاں کو دے گی محبّت کی تیغ آبِ حیات
ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا
اِس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے
طلوعِ صبح کی مانند تھرتھرائے جا
نگاہِ یار ترا یوں تو ہے پیام کچھ اور
مگر کرم بھی کیے جا، ستم بھی ڈھائے جا

آج بھی کام محبّت کے بہت نازک ہیں
دِل وُہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں،
وُہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
دیکھ سکنے کی الگ بات، مگر حُسن ترا
دولتِ دیدہ صاحبِ نظراں ہے کہ جو تھا

پردہ دارئ غم ہے شاکی
تُو نے حال تو پوچھا ہوتا
آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے
آج تو کوئی آیا ہوتا
منزلِ منزلِ دِل بھٹکے گا
آج تمھی نے روکا ہوتا
مَیں ہُوں، دِل ہے تنہائی ہے
تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا

وہ شانِ خامُشی کہ بہاریں ہیں مُنتظِر
وہ رنگِ گفتگو کہ گلستاں کھِلا دِیا
تھی یُوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اُٹھا فراق کہ مَیں مُسکرا دِیا

قفس سے چھُٹ کے وطن کا سُراغ بھی نہ مِلا
وہ رنگِ لالہ و گُل تھا کہ باغ بھی نہ مِلا

نگاہِ یار خبر تھی نہ تیرے وعدوں کی
جو تُو نے یاد دِلایا تو مجھ کو یاد آیا

وہ سوز و درد مِٹ گئے وہ زندگی بدل گئی
سوالِ عشق ہے ابھی یہ کیا کِیا ؟ یہ کیا ہُوا ؟

سازِ مجاز کی مَیں صدائے شکستہ ہُوں
خمیازہ کش ہُوں ہستیٔ ناپائیدار کا
اب عشق ماورائے نشاط و ملال ہے
کچھ اِضطرابِ دید، نہ غمِ اِنتظار کا
مارا ہے کِس ادا سے دِلِ سوگوار کو
کُشتہ ہُوں تیری پُرسشِ بیگانہ وار کا

پیمانۂ حیات ہے اِک جامِ بے خودی
یہ جس کے مُنھ لگا وہ رہے ہوشیار کیا
رگ رگ میں دوڑ گئیں آج بجلیاں فراق
ہو اور شرمگیں نگہِ شرمسار کیا

کہیں یہی نہ ہو آغاز ربطِ پنہاں کا
تری نگاہ میں پہلے تو یہ حجاب نہ تھا
بڑھا رہا ہے کوئی رسم و راہ کیا دل سے
سپردگی کی ادا میں یہ اجتناب نہ تھا
بس اِک نظر سے جُنوں کو بنا لیا مانُوس
یہ رنگِ حُسن تو پروردۂ حجاب نہ تھا
فراقؔ یاد کر ایسا بھی کوئی عالمِ عشق
جو ایک شب کا فسانہ نہ تھا جو خواب نہ تھا

ابھی تو اے غمِ پنہاں جہان بدلا ہے
ابھی کچھ اور زمانہ کے کام آئے جا
کھُلیں نہ حُسن کی فطرت کے راز عاشق پر
برتِ خلوص بھی، جھُوٹی قسم بھی کھائے جا
فسُونِ نیم شبی نرگسِ خمار آلُود،
تیرے نثار، یہ جادُو ابھی جگائے جا
فراقؔ چھیڑ دیا تُو نے کیا فسانۂ درد
مجھ میں کچھ نہیں آتا، مگر سنائے جا

صدائے بازگشت بھی دیارِ عشق میں نہیں
جواب کا تو خیر ذکر کیا، مگر پکارے جا
فضائے کائنات آنکھ کھولتی چلی فراق
یہ نغمہ ہائے زندگی، سُنائے جا سُنائے جا

یہ کہہ کے ڈالی بنائے دِل، دستِ غیب نے گلشنِ جہاں میں
چمن کے ہر خار و خس کے نیچے دبا ہُوا اِک شرار ہو گا
نہ پُوچھ کس کاوشِ نہاں سے، سکون سا آچلا دِلوں میں
اُمید تھی پردہ دار جس کی، وہ راز اب آشکار ہو گا
کہیں مٹانے سے مِٹ سکی ہیں نشانیاں کُشتگانِ غم کی،
طلسم اندر طلسم ہو گا، مزار اندر مزار ہو گا
درازیٔ شامِ غم کے ہاتھوں تڑپتے دل بھی ٹھہر چلے ہیں
بچھڑ کے تجھ سے کوئی کہاں تک ستم کشِ انتظار ہو گا
نثار پیمانِ دوستی کے، مگر ہے گردش میں آسماں بھی
جو یادِ ماضی پہ منحصر ہو وہ عہد کیا اُستوار ہو گا

دِل اُمڈا سا، آنکھ بھری سی
آج تو حُسن بھی ہے اپنا سا
بے لنگر ہے پریم کی کشتی
رُوپ بھی ہے چڑھتا دریا سا
آج یہ کَون ہے میرے آگے
کچھ دیکھا، کچھ اَن دیکھا سا
آہ ترے غم کا دَل بادل
عالم عالم چھایا ہُوا سا

نہ پُوچھ تیری محبّت میں ہاتھ کیا آیا
نہ چاہیے مجھے اب کچھ بھی اور، بھر پایا
تھے تجھ سے یا تھے زمانے سے بے خبر اے دوست
یہ جان بوجھ کے دھوکا دِلوں نے کیوں کھایا
نگاہِ ہوش رُبا تک تو تھے حواس بجا
مَیں کھو گیا ہُوں اُن آنکھوں کا جب پتا پایا
تو عشق ہی کی پشیمانیوں کو رونا ہے
تجھے خبر ہی نہیں حُسن بھی تو پچھتایا

دِلوں نے تجھ سے بھی جس کو بچا کے رکھا تھا
نگاہِ یار ، وُہی درد آج کام آیا

کئی بجلیاں بے گرے گر پڑی ہیں
اِن آنکھوں کو اب آ گیا مُسکرانا
الم کیا ، خوشی کیا کہ دیکھا ہے ہم نے
الم کا ہنسانا ، خوشی کا رُلانا
اسی دل کی قسمت میں تنہائیاں تھیں
کبھی جس نے اپنا پرایا نہ جانا

خوشی کے واسطے پیدا ہُوا ہے کون دُنیا میں
مگر ہر غم بھی اہلِ درد کے شایاں نہیں ہوتا
بجا یہ آہ و زاری ، چشمِ پُرنم بھی بجا ، لیکن
غمِ ہجراں بھی سُنتے ہیں غمِ جاناں نہیں ہوتا
وُہی ہے مِصر میں ہر کوچہ و بازار کی رَونق
مگر ہر بکنے والا یُوسفِ کنعاں نہیں ہوتا

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ خوش ہونا محبّت میں
کبھی مشکل نہیں ہوتا، کبھی آساں نہیں ہوتا
نگاہِ اہلِ دِل سے انقلاب آئے ہیں دُنیا میں
یقیں رکھ عشق اتنا بے سروساماں نہیں ہوتا

کیا نیند آئے اس کو جسے جاگنا نہ آئے
جو دِن کو دِن کرے وہ کرے رات کو بھی رات
اہلِ رضا میں شانِ بغاوت بھی ہو ذرا
اتنی بھی زندگی نہ ہو پابندِ رسمیات
ہم اہلِ دِل ہیں چشمِ کرم سے بھی بے نیاز
سُن اے نگاہِ یار اب اگر آ پڑی ہے بات
پیدا کرے زمین نئی، آسماں نیا
اتنا تو لے کوئی اثرِ دورِ کائنات
مجھ کو تو غم نے فرصتِ غم بھی نہ دی فراق
دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

جلوہ گر ہوتا ہے کوئی، رسمساتی ہے حیات
ٹوٹتا ہے مدّتوں کے بعد خوابِ کائنات
حُسن کا جادُو جگائے اِک زمانہ ہو گیا
اے سکوتِ شامِ غم پھر چھیڑ اُن آنکھوں کی بات
صُلحِ کُل وہ کیا سراسر جو نہ ہو شانِ جہاد
زندگی کو یُوں نہ کر نادان صرفِ رسمیات
پیش خیمہ نظمِ نَو کا ہے یہ دَورِ کُشت و خوں
مَوت کے ہاتھوں سجائی جائے گی بزمِ حیات
سَر اُٹھا ہاں سجدۂ دیر و حرم سے سَر اُٹھا
وہ جھلکتی ہے اُفق پر آستانِ کائنات
کیا ہُوا؟ کچھ بھی نہیں اور یُوں تو سب کچھ ہو گیا
معنیٔ بے لفظ ہے اے دوست دِل کی واردات
مَیں نے اس آواز کو پالا ہے مَر مَر کے فراؔق
آج جس کی نرم لَو ہے شمعِ محرابِ حیات

بازیٔ عشق کی پُوچھ نہ بات
جیت کی جیت ہے مات کی مات

اپنا دیس بھی اب ہے بدیس
اپنی خبر بھی دُور کی بات
جینے والے جی لیں گے
اب نہ مِلو گے؟ اچھی بات

کچُھ اِس طرح نگہِ یار شرمسار ہَے آج
سکُونِ غفلتِ ہستی بھی بے قرار ہَے آج
چمن میں کھوئے ہُوئے سے ہیں رنگ و بُو والے
بہارِ باغ بھی گمُ کردہ بہار ہَے آج
نبا ہے جانتے ہیں آدابِ مَے کشی ورنہ
نہ کوئی مَست ہے ساقی نہ ہوشیار ہے آج
اُٹھا اُٹھا نگہِ آشنائے صبحِ حیات
گراں دِلوں پہ بہت دَورِ روزگار ہے آج
کِسی کی یاد میں یہ لرزشِ خفی کیسی
سکُونِ عِشق سے کیوں حُسن بے قرار ہے آج
نِگاہِ یار! تغافلؔ شِعاریوں کے نثار

تِرا کرم تری پُرسش بھی ناگوار ہے آج

لرز رہی ہے فضا عالمِ محبّت کی
کچھ اِس طرح نگہِ یار شرمسار ہے آج
فراقؔ ! رازِ سکوتِ زباں دراز نہ پُوچھ
خطابِ حُسن باندازِ اختصار ہے آج

جن کو مَیں آرزُو سمجھتا تھا
میرے کچھ خواب تھے وہ گرد آلوُد

عشق کیا ؟ حسن کا خلُوصِ پنہاں
حُسن کیا ؟ عشق کی بس اِک چُمکار

مستیوں میں یک بیک آنا حجاب
جیسے چھائے جھُوم کر ابرِ بہار
کیوں کیا پاسِ دِلِ عُجلت پسند
جس کی ہستی ہے سراپا انتظار
شوخیوں میں جلوہ ہائے صبحِ جشن

مستیوں میں عالمِ شب ہائے نالہ

سامنا ہے اُس کے جلووں کا فراقؔ
جس کا چُھپنا بھی ہے برق بے قرار

رُوئے خنداں غیرتِ صبحِ بہار
چشمِ پُرنم شامِ انجم در کنار
ذرّہ ذرّہ آفتابِ روزِ حشر
قطرہ قطرہ بحرِ ناپیدا کنار
صُبح عکسِ جلوۂ رُوئے نگار
رات موجِ نکہتِ گیسوئے یار
بیٹھے بیٹھے کس کا دھیان آیا فراقؔ
دِل اُمڈ آیا ہے جو پیمانہ وار

خیالِ زلف و رُخ، اے اہلِ زنداں ہوش میں آؤ
دیارِ حُسن کی یہ شام کب تک یہ سحر کب تک
کِسی کا حُسن رُسوا ہو گیا پردے ہی پردے میں
نہ لائے رنگ آخر کار تاثیرِ نظر کب تک

خیالِ مرگ کب تک زندگی کا دردِ سر کب تک
یہ مانا صبر کرتے ہیں محبّت میں مگر کب تک
کسی پر مہرباں ہوتے ہیں لیکن یوُں نہیں ہوتے
سراسر لُطف کے پردے میں جَورِ سر بسر کب تک
حجابِ حُسن اگر ہیں جلوہ مہر و مہ و انجم
نظر نمو رو کے رکھّیں ہم بھی تا حدِّ نظر کب تک
سکوُتِ عِشق میں ہنگامہ زارِ زندگی گُم ہو
کریں رُودادِ غم ہائے نہانی مختصر کب تک
فراقؔ! اندازِ وحشت اب بدل دیں ہوش میں آئیں
کہ ہیں ژولیدہ مُو، آشفتہ سَر، حیراں نظر کب تک

کچھ مُضطرب سی عِشق کی دُنیا ہے آج تک
جیسے کہ حسُن کو نہیں دیکھا ہے آج تک
بس اِک جھلک دِکھا کے جسے توُ گُزر گیا
وہ چشم شوق محوِ تماشا ہے آج تک
جس کے خلوصِ عشق کے افسانے بن گئے
تجھ کو اُسی سے رنجِ بیجا ہے آج تک

مُدّت ہُوئی کِسی کو مِٹے کُوئے یار میں
اِک ناتواں غُبار سا اُٹھتا ہے آج تک
چھیڑا ہے غم نے پھر وُہی دِل کا معاملہ
جس کو اُٹھا رکھا ہے اِن آنکھوں نے آج تک
تُو نے کبھی کِیا تھا جُدائی کا تذکرہ
دِل کو وہی لگا ہُوا کھٹکا ہے آج تک
اِس راز کی خود اہلِ وفا کو خبر نہیں
جس طرح تیرے غم نے نباہا ہے آج تک
تا عُمر یہ فراقؔ! بجا دِل گرفتگی!
پہلُو میں کیا وہ درد بھی رکھا ہے آج تک

حُسن ہے دریا عشق ہے شُعلہ
پانی میں لگ جائے نہ آگ
دریا دریا گریۂ عِشق
صِحرا صحرا عِشق کی آگ
آتے ہی جل اُٹھے چراغ

رُوپ ہے تیرا دیپک راگ

پریم اَور رُوپ کی لِیلا ہے
کیا لگاؤ، کہاں کی لاگ
بولتا ساز ہے رُوپ کِسی کا
چِھڑا ہُوا ہے پریم بہاگ
کومل پاؤں پڑا ہے لیکن
جیسے دھرتی جائے جاگ
حُسن نے جب ہنس کر چھیڑا
لایا عِشق، ہزاروں راگ
جِھل مِل جِھل مِل تیرا رُوپ
جُگ جُگ جُگ جُگ تیرا سہاگ

ہم سے ہے گرم سینۂ ہستی
وہ بھڑکتے شرار ہیں ہم لوگ
ہم نے فردا کو کر دِیا اِمروز
کیا قیامت شعار ہیں ہم لوگ

اہلِ دل کو کوئی خوشی نہ ملال
اب تو بس وہ ہیں اور تیرا خیال
زندگی کروٹیں بدلتی ہے
تھرتھراتا ہے نظمِ ماضی و حال

ساکت ساکت شورشِ عالم
دل کی صدا بھی مدّھم مدّھم
رنگ ہے کس کا روپ ہے کس کا
نکھرا نکھرا ، مُبہم مُبہم
جاتی بہاریں ، آتی بہاریں
دونوں کا حاصل دیدۂ پُرنم
عشق میں سچ ہی کا رونا ہے
جھُوٹے نہیں تم جھُوٹے نہیں ہم
حاصلِ عشق یہی کیا کم ہے
کچھ مجھ کو غم ، کچھ تجھ کو غم
ہم نے آج فراق کو دیکھا
سوزِ مکمل ہا دردِ مجسم

اپنے پیمانِ وفا پھر یاد کر لے ایک بار
آج ہوتے ہیں جُدا اے دوست تیرے دل سے ہم
رُوٹھ کر تجھ سے بہت بیدرد ہم بھی ہو گئے
ایک خنجر ہو گئے جب سے کھنچے قاتل سے ہم
جان لیوا اے حسینو گو ہیں سرگردانیاں
کیوں بہک جاتے ہیں لیکن خود رہِ منزل سے ہم

عدم کو درد نرالے کے جیتے جی پہنچے
کہیں اجل سے یہ صدمے اُٹھائے جاتے ہیں
نصیبِ عشق جہاں سو رہے ہیں موت کی نیند
وہیں اُس آنکھ کے جادُو جگائے جاتے ہیں
حریفِ زخمِ نہاں نشترِ نظر بھی نہیں
بہت بچا کے یہ چرکے لگائے جاتے ہیں
اُنھیں بہار کی آنکھوں نے بھی نہیں دیکھا
جو گُل چمن کو مِٹا کر کھلائے جاتے ہیں
غبارِ راہِ طلب اُٹھ کے بیٹھ بھی نہ سکا
فراق ! ابھی سے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

دیکھنے والے ترے آج بھی بیدار سے ہیں
آج بھی آنکھ لگائے رسن و دار سے ہیں
سرفروشانِ محبّت پہ ہیں احساں تیرے
تیرے ہاتھوں یہ سبکدوش گرانبار سے ہیں
تُو تو نادم نہ کر اے یار کہ تجھ پر مٹ کر
خود ہی ہم اپنی نگاہوں میں گنہگار سے ہیں
آہ یہ اتنے دِنوں بعد تری پُرسشِ غم
شکوے اِک عمر کے اپنے دلِ بیزار سے ہیں

وحشتیں بڑھ گئیں حد سے ترے دیوانوں میں
بستیاں ڈھونڈ رہی ہیں انھیں ویرانوں میں
بزمِ مے بے خود و بیتاب نہ کیوں ہو ساقی
موجِ بادہ ہے کہ درد اٹھتا ہے پیمانوں میں
"جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اُٹھے"
گرمیاں ہیں کچھ ابھی سوختہ سامانوں میں
اب وہ رنگِ چمن و خندۂ گُل بھی نہ رہے
اب وہ آثارِ جنوں بھی نہیں دیوانوں میں

اَب نہ وہ رات جب اُمیدیں بھی تھیں کچھ تجھ سے
اَب نہ وہ بات غمِ ہجر کے افسانوں میں

نہ ہو اِحساس تو سارا جہاں ہے بے حِس و مُردہ
گُداز دِل ہو تو دُکھتی رگیں مِلتی ہیں پتھّر میں
نشیمن جل رہے ہیں ہر چمن شعلہ بداماں ہے
یہ کِس نے بجلیاں رکھ دی تھیں ہر برگِ گُل تر میں
دِلِ غمگیں ذرا آواز دینا عُمرِ رفتہ کو
یہ حسرت آج کیسی ہے نگاہِ نازِ دلبر میں
چھڑا اِس رنگ سے افسانۂ بے دردیٔ قاتِل
شہیدِ ناز کو نیند آ گئی آغوشِ خنجر میں

سرخوشی میں بھی چونک اُٹھتا ہُوں
تیرے غم کی نشانیاں نہ گئیں
اب تو زُعمِ وفا مجھے بھی نہیں
کیوں تری سرگرانیاں نہ گئیں

اہلِ غم کو ترا پیمانِ وفا
یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں
خوش بھی ہو لیتے ہیں تیرے بیقرار
غم ہی غم ہو عشق میں ایسا نہیں
زندگی اے دوست غم کا نام ہے
یہ تو شاید شکوۂ بے جا نہیں

سب کی حالت ایک ہے ناداں
کون ہے غمگیں، کون ہے شاداں
دِل میں اُٹھا کے رکھ لے گلستاں
کر لے علاجِ تنگیٔ داماں
بختِ سیہ، گیسوئے پریشاں
یہ بھی شبستاں وہ بھی شبستاں
بے خبری کے ہیں سب عنواں
کون ہے گریاں کون ہے خنداں
اُس کا پانا ہے وہ کرشمہ
سوچ تو مشکل دیکھ تو آساں

دونوں گرد و غبارِ منزل
صبحِ وطن یا شامِ غریباں

وہ پچھلی شب نگہِ نرگسِ خمار آلوُد
کہ جیسے نیند میں ڈُوبی ہُوئی ہو چندر کرن
تجھے حیات کی بے صبریوں کا علم بھی ہے
یہ بات الگ کہ ہر اک اپنے حال میں ہے مگن
رُکی رُکی سی یہ آزردگی قیامت ہے
یہ کیا ادائیں ہیں تیری نہ کھُل کے رُوٹھ نہ من
ہمارے حال کی گویا تجھے خبر ہی نہیں
نگاہِ ناز! اب اتنا بھی اہلِ غم سے نہ بن
ترے جمال پہ کیا سادگی برستی ہے
عجیب فتنۂ معصوم ہے یہ بھولا پن

نرم فضا کی کروٹیں دِل کو دُکھا کے رہ گئیں
ٹھنڈی ہوائیں بھی تری یاد دلا کے رہ گئیں

یاد کچھ آئیں اِس طرح بھُولی ہُوئی کہانیاں
کھوئے ہُوئے دِلوں میں آج درد اُٹھا کے رہ گئیں

پُوچھ نہ ان نگاہوں کی طُرفہ کرشمہ سازیاں
فتنے سُلا کے رہ گئیں فتنے جگا کے رہ گئیں

تُم نہیں آئے اور رات رہ گئی راہ دیکھتی
تاروں کی محفلیں بھی آج آنکھیں بچھا کے رہ گئیں

کون سکُون دے سکا غم زدگانِ عشق کو
بھیگتی راتیں بھی فراق آگ لگا کے رہ گئیں

جنھیں ازل سے نہ راس آئے آسمان و زمین
بہت ہے ایسوں کو فردوسِ وعدہ کی تسکین
اگر بدل نہ دیا آدمی نے دُنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں
ہر انقلاب کے بعد آدمی سمجھتا ہے ،
کہ اس کے بعد نہ پھر لے گی کروٹیں یہ زمیں
بہت نہ بے کسیٔ عشق پر کوئی روئے

کہ حُسن کا بھی زمانے میں کوئی دوست نہیں

حدیں حُسن و محبّت کی مِلا کر
قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہُوں

خبر ہے تجھُ کو اے ضبطِ محبّت
ترِے ہاتھوں مَیں لُٹتا جا رہا ہُوں

جو اُن معصُوم آنکھوں نے دیے تھے
وہ دھوکے آج تک مَیں کھا رہا ہُوں

ترِے پہلو میں کیوں ہوتا ہے محسُوس
کہ تجھُ سے دُور ہوتا جا رہا ہُوں

جو اُلجھی تھی کبھی آدم کے ہاتھوں
وہ گُتھّی آج تک سُلجھا رہا ہُوں

محبّت اب محبّت ہو چلی ہے
تجھُے کیوں بھُولتا سا جا رہا ہُوں

اجل بھی جن کو سُن کر جھُومتی ہے
وہ نغمے زندگی کے گا رہا ہُوں

یہ سنّاٹا ہے میرے پاؤں کی چاپ
فراقؔ اپنی کچھُ آہٹ پا رہا ہُوں

تُو نے سمجھا ہی نہیں ہے حسن کا رازِ نشاط
تُو نے دیکھی ہی نہیں ہیں عشق کی رعنائیاں
سانس کو تازہ دل و جاں کو معطّر کر گئیں
اس نظر کی ٹھنڈی اور مہکی ہُوئی پرچھائیاں
چُپکے چُپکے اُٹھ رہا ہے مدبھرے سینوں میں درد
دِھیمے دِھیمے چل رہی ہیں عشق کی پُروائیاں

سَرِ محمُود اور پائے ایاز
عاشقی کچھ کِسی کا راج نہیں
مَوت کا بھی علاج ہو شاید
زندگی کا کوئی علاج نہیں
اس طرح جسمِ نازنیں کو نہ دیکھ
اپنی آنکھوں کی تجھ کو لاج نہیں
کر نہ عرضِ وفا فراقؔ کہ اب
اُن نگاہوں کا وہ مزاج نہیں

یہ بار بار وعدۂ سکوُن مرگ کِس لیے
تجھے اِس قدر تو اہلِ غم کو زندگی گراں نہیں
بقا تو کیا فنا گداز ہیں یہ شعُلے حسُن کے
طلوُعِ آفتابِ حشر میں یہ گرمیاں نہیں
سنبھل سنبھل کہ دردِ عشق دردِ لا عِلاج ہے
یہ مرگِ ناگہاں نہیں، حیاتِ جاوداں نہیں
فسانے غم کے ماورائے طوُل و اِختصار ہیں
جو راتیں کاٹ دیتی ہیں یہ وہ کہانیاں نہیں

کِیا ہے سیر گہِ زِندگی میں رُخ جس سمت
ترِے خیال سے ٹکرا کے رہ گیا ہُوں مَیں

چھلک کر کم نہ ہو ایسی کوئی شراب نہیں
نگاہِ نرگسِ رعنا ترِا جواب نہیں
زمین اُس کی، فلک اُس کا، کائنات اُس کی
کچھ ایسا عشق ترا خانماں خراب نہیں

غم و نشاط ترے کس طرح کوئی جانے
ہنسی لبوں پہ نہیں، آنکھ پُر آب نہیں
دِکھا تو دیتی ہے بہتر حیات کے سپنے
خراب ہو کے بھی یہ زندگی خراب نہیں

ننگِ محبّت ہے یہ آہ و فغاں
یُوں کہیں کرتے ہیں غمِ رفتگاں
چل گئی کیا جانیے کیسی ہوا
آج مجھے دِل سے بھی اُٹھّا دھواں
کچھ کوئی کہتے ہوئے چُپ ہو گیا
اَور سے اب اَور ہُوئی داستاں

فراق دَوڑ گئی رُوح سی زمانے میں
کہاں کا درد بھرا تھا مرے فسانے میں
وہ کوئی رنگ ہے جو اُڑ نہ جائے اے گُلِ تر
وہ کوئی بُو ہے جو رُسوا نہ ہو زمانے میں

یہ گُل کھِلے ہیں کہ چوٹیں جگر کی اُبھری ہیں
نہاں بہار تھی بُلبُل ترے ترانے میں
کسی کی حالتِ دل سُن کے اُٹھ گئیں آنکھیں
کہ جان پڑ گئی حسرت بھرے فسانے میں

سر میں سودا بھی نہیں دِل میں تمنّا بھی نہیں
لیکن اِس ترکِ محبّت کا بھروسا بھی نہیں
فطرتِ حُسن تو معلوم ہے تجھ کو ہمدم
چارہ ہی کیا ہے بجُز صبر، سو ہوتا بھی نہیں
جانے دے ہم بھی کچھ اپنے تو نہیں ناواقف
جا نہیں جور و ستم تیرے تو بےجا بھی نہیں
شکوۂ جور کرے کیا کوئی اُس شوخ سے جو
صاف قائل بھی نہیں صاف مُکرتا بھی نہیں
ایک مُدّت سے تِری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

بھول جاتے ہیں کسی کو مگر ایسا بھی نہیں
یاد کرتے ہیں کسی کو مگر اتنا بھی نہیں
بے خودی ہوشنما، ہوش بھی غفلت آثار
اِن نگاہوں نے کہیں کا مجھے رکھا ہی نہیں
کتنے بے تاب ہیں ہم دِل اسے دینے کے لیے
نِگہِ ناز کا کچھ ایسا تقاضا بھی نہیں

تھرتھری سی ہے آسمانوں میں
زور کچھ تو ہے ناتوانوں میں
کتنا خاموش ہے جہاں لیکن
اِک صدا آ رہی ہے کانوں میں
لوگ کیا کیا نہ ہار بیٹھے ہیں
زندگی کے قمار خانوں میں

قطع کر لے تعلّقات کہ ہم
قابلِ دید گاہ گاہ نہیں

موت بھی زندگی میں ڈوب گئی
یہ وہ دریا ہے جس کی تھاہ نہیں
ہے یہ دُنیا عمل کی جولانگاہ ،
میکدہ اور خانقاہ نہیں
تُو نہ بدلا نہ مَیں مگر اے دوست
آج وہ دِل نہیں وہ چاہ نہیں
یہ مساواتِ عِشق دیکھ فراق
اِمتیازِ گدا و شاہ نہیں

یہ برق خندۂ معصُوم ہے کہ داغِ گُناہ
مَیں آج رُوحِ طہارت سے کھیل سکتا ہُوں
مرے اُچھالے ہُوئے گیند مہر و ماہ و نجوم
مَیں اِک جہان کی قِسمت سے کھیل سکتا ہُوں
ازل کے دِن سے ہُوں گو پُر شکستہ و دِل تنگ
مَیں لامکاں کی بھی وسعت سے کھیل سکتا ہُوں
مَیں رنگ و بُوئے محبّت کی نرمیاں ہُوں فراق
کِسی کے ناز و نزاکت سے کھیل سکتا ہُوں

نہ پوچھ ہے مری مجبوریوں میں کیا کس بَل
مشیّتوں کی کلائی مروڑ سکتا ہوں
اُبل پڑیں ابھی آبِ حیات کے چشمے
شرار و سنگ کو ایسا نچوڑ سکتا ہوں
نگاہِ غیب بھی جن تک ابھی پہنچ نہ سکی
ان اُنگلیوں سے وہ تارے بھی توڑ سکتا ہوں
فراقؔ دیکھ بدلتی ہے منزلِ آفاق
کہ مہر و ماہ کی مَیں باگ موڑ سکتا ہوں

رازِ جمالِ نو بہ نو تو ہی بتا کہ مَیں تجھے
کھو کے بھی کھو سکا نہیں پا کے بھی پا سکا نہیں
آج تو خوابِ زندگی جاگ اُٹھا تڑپ اُٹھا
فلسفۂ جنونِ عشق حشر کا غلغلہ نہیں
تیری کشیدگی میں آج شانِ سپردگی بھی ہے
حُسن کے بس میں کیا ہے اور عشق کے بس میں کیا نہیں
اور ہیں نا اُمیدیاں عشق کی یُوں تو ہم نشیں
آہ بھی ہے شرر فشاں نالہ بھی نارسا نہیں

آہ وہ منزلِ مراد دُور بھی ہے قریب بھی
دیر ہُوئی کہ قافلے اُس کی طرف رواں نہیں
نظمِ جہاں بدل نہ جائے اہلِ جہاں سکُون پائیں
عشق کو بھی خوشی نہیں حُسن بھی شادماں نہیں
خُون شہیدِ عشق کا آج ہے زیبِ داستاں
نعرۂ انقلاب ہے ماتمِ رفتگاں نہیں
وقتِ بیانِ غم کچھ آج کھو سے گئے ہیں ہم فراقؔ
کَون سُنے کہ خود ہمیں مائلِ داستاں نہیں

کہاں یہ دَورِ آسماں کہاں یہ نظمِ زندگی
ہزاروں ایسی محفلیں وہ آنکھیں لے اُڑیں کہیں
چمن کی رازداریوں کا اے صبا خیال کر
اَب لہُو نہ دے اُٹھے گلُوں کی آستیں کہیں
اُسے گزُرتے دیکھ کر جھپک کے آنکھ رہ گئی،
شرارے اُڑ گئے تھے کچھ ابھی ابھی یہیں کہیں

شام بھی تھی دُھواں دُھواں حُسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

جنھیں پا کر نگاہوں میں دو عالم ہیچ ہوتے تھے
اب اُن نظروں کے ہاتھوں میں وہ سوغاتیں نہیں ہوتیں
فراقؔ اے کاش سُننے والوں کے سینے میں دِل ہوتا
حقیقت ہوتی ہے اشعار میں باتیں نہیں ہوتیں

مَوجِ صبا کی پُوچھ نہ سفّاک دستیاں
ڈُوبی ہُوئی ہیں خُون میں پھُولوں کی بستیاں
شاید مِرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے
کِس طرح اِک نظر سے بدلتی ہیں ہستیاں
آوازِ پائے ناز کو بھی مُدّتیں ہُوئیں
سُونی پڑی ہیں کب سے ترے غم کی بستیاں

ہیں اگرچہ اہلِ نظر کو بڑے بڑے دعوے
کہیں وہ جلوہ نما ہو تو دیکھتے رہ جائیں
وصال و ہجر کا ایسوں کے کچھ ٹھکانا ہے
نہ جا کے بھی جو نہ جائیں اور آکے بھی جو نہ آئیں

زمانہ بدلا ہے ایک آدھ کروٹوں سے کہیں
ابھی عناصرِ عالم کچھ اور پلٹے کھائیں
جہاں میں ترکِ تعلّق نہیں ہے ترکِ رسُوم
وہ سامنے ہوں تو ہم بھی کہاں تک آنکھ چرائیں
جو دیکھ لیں وہ ترے خندہ ہائے زیرِ لبی
چمن میں غنچۂ گُل دِل مسوس کر رہ جائیں
نہ ختم ہو جو کبھی وہ بھی داستاں ہُوئی ختم
جھپک رہی ہیں ستاروں کی آنکھیں اب سو جائیں

خط و خال کی تیرے پرچھائیاں ہیں
خیاباں گلُستاں گلستاں
وہی وحشتیں ہیں، وہی حسرتیں ہیں
گلُستاں گلُستاں بیاباں بیاباں
جھلا جھل سجل رُوپ کا رسمسانا
تہِ شبستاں چراغاں چراغاں
کمر سے خجل رقصِ شعلہ کی موجیں
نظر سے فضائیں گلُستاں گلُستاں

وہی اِک تبسّم چمن در چمن ہے،
وہی پنکھڑی ہے گلستاں گلستاں
زمیں تا فلک شامِ غم کا دُھندلکا
محبّت کی دنیا ہراساں ہراساں
یہی جذبِ پنہاں کی ہے داد کافی
چلے آؤ مجھ تک گریزاں گریزاں
فراقِ حزیں سے تو واقف تھے تم بھی
وہ کچھ کھویا کھویا، پریشاں پریشاں

کمی نہ کی ترے وحشی نے خاک اُڑانے میں
جنوں کا نام اُچھلتا رہا زمانے میں
غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

آج تو حسن و محبّت ہو گئے تھے مِل کے ایک
تُو نے لیکن وہ عالم نگاہِ ناز کا دیکھا نہیں

لے اُڑی مجھ کو نگاہِ شوق کیا جانے کہاں
تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ
کون پیمانہ ہے جو چُور نہیں

اپنی ہی گرمی سے آیا عشق میں اِک بانکپن
اپنی ہی گرمی سے گھائل ہو گیا حسنِ بُتاں

اُمیدِ دید بڑھ کے نہ فُرقت کی شام ہو
یہ حشرِ آرزو بھی نہ سودائے خام ہو
یُوں ہی لیے دیلے سرِ بزم اے نگاہِ ناز
اِس لُطفِ خاص میں بھی اِک اندازِ عام ہو
لے سرحدِ وجُود و عدم بھی گزر گئی
اے قلبِ مضطرب کہیں تجھ کو قیام ہو
ساقی وہ رنگِ نرگسِ رعنا کہ بزم میں

رِندوں کو بھی خبر نہ ہو، گردش میں جام ہو

یہ امتزاج تو دیکھو سکون و لرزش کا
نظر فریب ہے کیا جسم کے خطوں کا کھچاؤ
یہ تیرا جسم ہے یا راگنی ہے آ کے کھڑی
کہ آج تک تو نہ دیکھا تھا یہ بدن کا رچاؤ
بجا یہ ترکِ محبّت، بجا یہ عزمِ محال
کسی کو خیر نہ اب چاہنا، قسم تو نہ کھاؤ

زندگی کیا موت کیا، دو کروٹیں ہیں عشق کی
سونے والے چونک اٹھّیں گے قیامت بھی تو ہو
یہ نرے جلوے یہ چشمِ شوق کی حیرانیاں
برقِ حسنِ یار نظّارے کی فرصت بھی تو ہو
اب وہ اتنا بھی نہیں بیگانۂ وجہِ ملال
پرسشِ غم اس کو آتی ہے ضرورت بھی تو ہو

گر مطلعِ جہاں پہ چمکنے کا شوق ہے
تو صبح مثلِ شامِ غریباں مٹے چلو

اے رہروانِ عشق ہے جامِ فنا میں بھی
وہ نشّۂ حیات کہ بس جھومتے چلو
رازِ شناوری ہے یہی بحرِ عشق میں
ساحل کی یاد دِل سے بھلا کر بہے چلو

عشق رُسوا ہو چلا بے کیف سا بیزار سا
آج اُس کی نرگسِ غمّاز کی باتیں کرو
نام بھی لینا ہے جس کا اِک جہانِ رنگ و بُو
دوستو اُس نو بہارِ ناز کی باتیں کرو

ابھی تو بُلبلیں آسُودۂ نشیمن ہیں
گلو! کچھ اَور بھی رنگ و بُو کے جال بچھاؤ
نہ عشق ہی کو خبر ہو، نہ حُسن ہی جانے
کِسی سے عالمِ مستی میں اِس طرح کھُل جاؤ
نہ پُوچھ اُلجھی ہُوئی گُتھیاں محبّت کی
نہ پُوچھ حُسن کی باتوں میں کِتنا ہے سُلجھاؤ

تڑپ کو ہم نے بنایا سکونِ بے پایاں
ہماری دُکھ بھری لَے میں ہے کس قدر ٹھہراؤ

وہ شوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا
اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اُسے بیگانہ

دیارِ غیر میں سوزِ وطن کی آنچ نہ پُوچھ
خزاں میں صُبحِ بہارِ چمن کی آنچ نہ پُوچھ
تمام بادِ بہاری، تمام خندۂ گُل
شمیمِ زُلف کی ٹھنڈک بدن کی آنچ نہ پُوچھ
شعاعِ مہرِ قیامت ہے یہ سنہری لکیر
جبینِ ناز پہ خطِّ شِکن کی آنچ نہ پُوچھ
یہ سوز و ساز نہ جنّت میں ہے نہ دوزخ میں
دِلوں میں کیا ہے، نشاط و محن کی آنچ نہ پُوچھ

حُسن کے جلوے کر عیاں عشق کی ظلمتیں نہ دیکھ
تُو ہے خوشی کی داستاں غم کی عبارتیں نہ دیکھ

غمکدۂ مجاز میں، عالمِ سوز و ساز میں
غفلتِ صد نشاط میں درد کی کثرتیں نہ دیکھ
صُبحِ وصال و شامِ ہجر اصل میں ایک ہیں فراقؔ
حُسن کے جلوے بھول جا، شام کی ظلمتیں نہ دیکھ

کٹ جاتی ہے اب بھی کٹنے کو لیکن اِک وہ بھی زمانہ تھا
جب رات رات سی ہوتی تھی، جب صُبح صُبح سی ہوتی تھی
وہ رات فراقؔ ہے یاد مجھے، اب تک وہ صُبح نہیں بھولی
جو کٹتے کٹتے کٹتی تھی، جو ہوتے ہوتے ہوتی تھی

جس طرح تار میں نغمہ ہے نہاں، پھولوں میں بُو
میری رگ رگ میں اِس طرح ہے پنہاں کوئی،
داغِ دل بادِ بہاری کے اُبھر آئے ہیں
آہ سمجھا ہی نہیں رازِ گلستاں کوئی
کہیں اُٹھتے ہیں کہیں پڑتے ہیں پائے رنگیں
مجھ تک آتا ہے یہ اندازِ گریزاں کوئی

رکھ لی جنھوں نے کشمکشِ زندگی کی لاج
بے دردیاں نہ پوچھیے اُن سے حیات کی
اِس بزمِ بیخودی میں وجُود و عدم کہاں
چلتی نہیں ہے سانس حیات و ممات کی

وہ ماجرائے عشق بھی خواب و خیال ہے
تیری نگاہ سے جو ہُوا تھا بیاں کبھی
سر بھی انھیں ملا در و دیوار بھی مگر
کم ہو سکی نہ وحشتِ زندانیاں کبھی

بہت دِنوں میں محبّت کو یہ ہُوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گُزری وہ رات رات ہُوئی
دیارِ دِل میں یہ پرچھائیاں نہیں پڑتیں
حریمِ عشق میں دِن ہی ہُوا نہ رات ہُوئی

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

ہم سے کیا ہو سکا محبّت میں
تو نے تو خیر بے وفائی کی

زندگی کو وفا کی راہوں میں
موت خود روشنی دکھاتی تھی

تمام شبنم و گُل ہے وہ سر سے تا بہ قدم
رُکے رُکے سے کچھ آنسو رُکی رُکی سی ہنسی

جب جب اُسے سوچا ہے دِل تھام لیا میں نے
انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ کیا گزری

رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی
وہ پَو پھٹی وہ نئی زِندگی نظر آئی
دِلوں میں آج تری یاد مُدّتوں کے بعد
بجھے بجھے سے تبسّم بچشمِ تر آئے

کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی
امّیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

ترا ہی عکس سرشکِ غم زمانہ تھا
نگاہ میں تری تصویر سی اُتر آئی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

دیکھا تھا جس نے تجھ کو زمان و مکاں سے دُور
وہ آنکھ بے قرارِ تماشا ہے آج بھی

اِک رنگ پر دو رنگیٔ عالم ازل سے ہے
اِک جام صبح و شام چھلکتا ہے آج بھی

جوشِ جُنوں سے قطعِ نظر کر کے عشق کا
سُنتے ہیں قصدِ جانبِ صحرا ہے آج بھی

اس پُرسشِ کرم پہ تو آنسو نِکل پڑے
کیا تو وُہی خلوصِ سراپا ہے آج بھی

سچ جھوٹ کی خبر تو کِسے لیکن اے فراق
کوئی بیانِ درد سناتا ہے آج بھی

کیا جام ہے فراق محبّت کا جام بھی
آبِ حیات بھی ہے، اجل کا پیام بھی
کیا جانیے کرشمے یہ کِس کے جنُوں کے ہیں
یہ گُلستانِ صُبح، یہ صحرائے شام بھی
گُل بے وفا شمیم و صبا دونوں بے قرار
باغِ جہاں میں ہے کہیں رنگِ قیام بھی
آ ساقیا کہ دیر سے ہیں رِند منتظر
چھلکی شرابِ ناب بھی ٹکرائے جام بھی
اُڑتی ہُوئی لپیٹ یہ اُنھیں گیسوؤں کی ہے
گُزرا ہے اِس طرف سے وہ مستِ خرام بھی
کھا جائے برقِ طُور جہاں ٹھوکریں فراق
راہِ وفا میں آتے ہیں ایسے مقام بھی

یہ تنِ نازنیں کی انگڑائی
[illegible] لچکائی

لیتی ہے کائنات انگڑائی
وہ کہانی نظر نے دوہرائی
صبحِ فرقت نہ اہلِ غم کو جگا
روئے ہیں رات بھر تو نیند آئی
شامِ غم کو تری جھلک نہ ملی
تاروں نے بھی نگاہ دوڑائی
اب تو یادِ دلِ حزیں کے لیے
اِک کہانی ہے تیری رعنائی

کبھی دیوانے رو بھی پڑتے تھے
کبھی تیری بھی یاد آتی تھی
زِندگی زندگی کو وقتِ سفر
کارواں کارواں چھپاتی تھی
غم کی وہ داستانِ نیم شبی
آسمانوں کو نیند آتی تھی

ذرا دیکھو تو حُسن و عشق کی دُنیا کہاں پہنچی
فراقؔ اب تک لیے بیٹھے ہو آشفتہ سری اپنی

پکڑ لیا سرِ محشر کسی نے ہاتھ مِرا
بس آج مِل گئی اپنی وفا کی داد مجھے
یہ انقلاب دِلوں کا بھی کم ہُوا ہوگا
نہ مَیں ہُوں یاد تمھیں اب نہ تم ہو یاد مجھے

اب ماورائے وہم و گماں ہے سکوتِ حُسن
وہ سُن چُکے فسانۂ غم ، ہم سُنا چُکے
اب حُسن کی گھٹیں کہ بڑھیں فتنہ خیزیاں
مُدّت ہُوئی کہ ہوش میں دیوانے آ چُکے
اَے دِل حیاتِ عشق کا پانا مُحال ہے
ہم جان تک تو اپنی اِسی میں گنوا چُکے
اِن گردشوں میں کاوشِ صبر و سکُوں ہے اب
آوارگانِ دشتِ جنوں خاک اُڑا چُکے

اے دوست یہ کوئی زندگی ہے
جو تجھ سے بچھڑ کے کٹ رہی ہے
دے جی کے ثبوتِ مرگ ناداں
مرنے کی ہوس کم آگہی ہے
اے دردِ فراق، اے غمِ یار
بے تاب بھی ہوں میں صبر بھی ہے

پیامِ کیفِ عدم نغمۂ مجاز بھی ہے
نوائے ساز صدائے شکستِ ساز بھی ہے
حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل
کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے
کچھ عجب کشمکشِ ہوش و بیخودی ہے فراق
کہ مختصر بھی شبِ ہجر ہے، دراز بھی ہے

عجب کیا کچھ دنوں کے بعد یہ دُنیا بھی دُنیا ہو
یہ کیا کم ہے محبت کو محبت کر دیا میں نے

چُپ ہو گئے تیرے رونے والے
دُنیا کا خیال آ گیا ہے

اِس دَور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

جب سے تم پردیس سدھارے، آنسو ہیں آنکھوں کے تارے
آتے ہیں کیا تان اُڑاتے، پریم کے گھائل رُوپ کے مارے
رات کی دیوی چھم چھم اُتری، کون ڈبوئے، کون اُبھارے
دریا دریا پیاسے دِل کو، کون ڈبوئے، کون اُبھارے
نظمِ جہاں میں کون کمی ہے، چکّر میں ہیں کیوں سیّارے

کچھ بڑھ گئی وحشت اور مری زنداں سے رہائی پاتے ہی
کچھ حسرت صحرا کی بھی ہے، کچھ رنجِ در و دیوار بھی ہے
اُمّید نہ دے پُرسش بھی نہ کر، دے اور فریبِ حُسن کوئی
مایوسوں کا خوش ہو جانا آسان بھی ہے دُشوار بھی ہے

دِن رات شگوفے کھلتے ہیں، دِن رات بہاریں کٹتی ہیں
تدبیرِ جُنوں، تقدیرِ چمن، ایّام کی کچھ رفتار بھی ہے

اِک تارِ نِگاہ کی جنبش سے شہ عشق کو دیتی ہے کیا کیا
وہ آنکھ جو مائلِ صُلح بھی ہے، آمادۂ صد پیکار بھی ہے

رَہ رَہ کے خلش بھی ہوتی ہے، کچھ کشمکشِ دل بھی کم ہے
سُنتے ہیں فراقؔ وہ تیرِ نظر دِل میں بھی ہے دِل کے پار بھی ہے

تجھ کو اے بادِ صبا شوخیٔ پیہم کی قسم
اِس طرح چھیڑ کہ ہر گُل کو گلستاں کر دے

زندگی تیرے تغافل نے بنا دی مشکل
اب اسے اے نگہِ یار کچھ آساں کر دے

جنھیں ہے ناز بہت اپنے ظرف پر ساقی
تری نگاہ سے انداز اُن کے پائے ہوئے

وہ نرم نرم ہوائیں ہیں کس کے دامن کی

چراغِ دیر و حرم بھی ہیں جھلملائے ہوئے

خراب اور نہ کر اب خراب حالوں کو
ہماری خاک سے دامن ذرا بچائے ہوئے
خبر یہ ہے کہ سرِ حشر بھی نہیں چھوٹے
تری نگاہِ کرم کے فریب کھائے ہوئے
فراق تو ہی مسافر ہے تو ہی منزل ہے
کدھر چلا ہے محبت کی چوٹ کھائے ہوئے

تو کبھی بجلیوں سے کھیلا ہے؟
تو کسی کی نگاہ کیا جانے
آج تو کفرِ عشق چونک اُٹھا
آج تو بول اُٹھے ہیں بت خانے
چھُٹ کے گھر آ گئے اسیر ترے
لیکن اب اُن کو کون پہچانے
اُٹھنے والی ہے وہ نگاہِ کرم
عشق بھی کچھ لگا ہے شرمانے
بعد مدت کے تیرے ہجر میں پھر
آج بیٹھا ہوں دل کو سمجھانے

نہ آنا تیرا اب بھی گرچہ دل تڑپا ہی جاتا ہے
تڑپ جانے پہ بھی لیکن سکوں سا آ ہی جاتا ہے
ہزاروں ہیں جو خود کو بے نیازِ غم سمجھتے ہیں
کبھی کچھ ابر سا لیکن دِلوں پر چھا ہی جاتا ہے
مرا غم پرستشوں کی دسترس سے دُور ہے ہمدم
مگر خوش ہوں کہ جو آتا ہے کچھ سمجھا ہی جاتا ہے
دلِ ناداں محبت میں خوشی کا یہ بھرم کیا خوب
تری اس سادگی پر حُسن کو پیار آ ہی جاتا ہے
اُلٹ جاتی ہیں تدبیریں، پلٹ جاتی ہیں تقدیریں
اگر ڈھونڈھے نئی دُنیا تو انساں پا ہی جاتا ہے

تجھ کو پا کر بھی تمنّا کا وُہی جوش رہے
آہ وہ شوق جو آغوش در آغوش رہے
آج وہ تجھ سے بہت دُور ہیں پا کر بھی تجھے
غمِ تنہائی سے جو لوگ ہم آغوش رہے

مجھ کو مارا ہے ہر اک درد و دوا سے پہلے
دی سزا عشق نے ہر جرم و خطا سے پہلے
خود بخود چاک ہوئے پیرہن لالہ و گل
چل گئی کون ہوا بادِ صبا سے پہلے

اپنے مقام پر رہیں عشق کی بے نیازیاں
گو درِ خلد کھلے دل نے کہا کہ کون جائے
عالمِ حسن و عشق کی کون وہ بات ہے جسے
بھولیں اگر تو یاد آئے، یاد کریں تو بھول جائے
گو ہمہ تن وہ جبر ہے، کہتی ہیں یہ مشیّتیں
ہم سے بھی کچھ نہ بن پڑے عشق جو اپنی ضد پہ آئے
کشتیٔ دل بچائیے اتنا مگر رہے خیال
ڈوبے اگر تو پار ہو، پار لگے تو ڈوب جائے

کہہ گئی کیا نگہِ ناز تری ہم جس کو
بات کی بات فسانے کا فسانہ سمجھے
اپنے دل بہلانے کا دنیا میں ٹھکانا ہے کہیں
[illegible] اپنا جسے سمجھے نہ تمہارا سمجھے

ماتھے پہ ترے صبحِ چمن کھیل رہی ہے
آنکھوں میں محبّت کی کرن کھیل رہی ہے

ناگن کوئی بل کھاتی ہے پیہم، کہ ہوا سے
وہ زُلف شکن زیرِ شکن کھیل رہی ہے

پیراہنِ خوش وضع سے آتی ہے لپٹ سی
ملبوس میں خوشبوئے بدن کھیل رہی ہے

اُس پیکرِ رنگیں میں زہے شوخیِ پنہاں
بجلی تہِ دامانِ چمن کھیل رہی ہے

باتوں میں فراقؔ اس کی معطّر ہے سماعت
ہر لفظ میں خوشبوئے دہن کھیل رہی ہے

جو ہونٹوں تک ترے محدود رہتی ہے، سحر ہوتے
اُفق پر دُور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے

کسی کا قامتِ شاداب ہے وہ مصرعۂ رنگیں
کہ جس کے سامنے فکرِ غزل شرمائی جاتی ہے

محبّت آنکھ جھپکاتی ہے پلکیں غم کی بھاری ہیں
[illegible] شامِ فراق اب نیند آتی ہے

بزمِ برشگال

مُطرب سے کہو آج اِس انداز سے گائے
ہر دِل کو لگے چوٹ سی ہر آنکھ بھر آئے
وہ سوز جو تاریکیوں میں شمع جلائے
وہ ساز جو سوئی ہُوئی یادوں کو جگائے
پلکوں کے تلے مَیکدۂ راز کے جلوے
ظُلمت میں گُناہوں کے چراغوں کو جلائے
کوندا ہو گداز اُف یہ تبسُّم کی گھلاوٹ
لہجے کی کھنک، لَو جو ستاروں سے چُرائے
وہ مستیٔ قامت کہ گھٹا جھُوم کے اُٹھّے
وہ چُستیٔ ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے
وہ نرم کلائی کہ سکوُت آنکھ اُٹھاوے
آہستہ خرامی کی فضا وجد میں آئے
وہ شوخیٔ محتاط کے بچتے ہُوئے انداز
دُنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ ہو جائے

یہ کم نگہی چشمِ فسوں ساز کی کیسی
دیوانہ بناتا ہے تو دیوانہ بنائے

نس نس میں کوئی جیسے دبی چٹکیاں بھر دے
رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے

زلفِ عرق آلود کی وہ تاروں بھری رات
روئے شفق آمیز سے پو پھوٹتی جائے

کیوں تیرے غمِ ہجر میں نمناک ہیں آنکھیں
کیوں یاد تری آتے ہی تارے نکل آئے

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اک تیز چھری ہے جو اترتی چلی جائے

کچھ ایسی بھی گزری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

آج کی دنیا

دنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج

وہ سر اُٹھائے موجِ فنا آ رہی ہے آج
موجِ حیات موت سے ٹکرا رہی ہے آج
کانوں میں زلزلوں کی دھمک آ رہی ہے آج
ہر چیز کائنات کی تھرّا رہی ہے آج
جھپکا رہی ہے دیر سے آنکھیں ہوائے دہر
کون و مکاں کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج
ہر لفظ کے معانی و مطلب بدل چکے
ہر بات اور بات ہُوئی جا رہی ہے آج
یکسر جہانِ حُسن بھی بدلا ہوا سا ہے
دُنیائے عشق اور نظر آ رہی ہے آج
ہر ہر شکستِ ساز میں صد لحنِ سرمدی
یا زندگی کے گیت اجل گا رہی ہے آج
یہ دامنِ اجل ہے کہ تحریکِ غیب ہے
کیا شئے ہوائے دہر کو سُلگا رہی ہے آج
ابنائے دہر لیتے ہیں یُوں سانس گرم و تیز
جینے میں جیسے دیر ہُوئی جا رہی ہے آج

افلاک کی جبیں بھی شکن در شکن سی ہے
تیوری زمیں کی بھی چڑھی جا رہی ہے آج
پھر چھیڑتی ہے موت حیاتِ فسردہ کو
پھر آتشِ خموش کو اُکسا رہی ہے آج
برہم سا کچھ مزاجِ عناصر ہے اِن دِنوں
اور کچھ طبیعت اپنی بھی گھبرا رہی ہے آج
اِک موجِ درد سینے میں لرزاں ہے اِس طرح
ناگن سی جیسے شیشے میں لہرا رہی ہے آج

رُباعیات

ہر جلوہ سے اِک درس نمو لیتا ہُوں
چھلکے ہُوئے صد جام و سبو لیتا ہُوں
پڑتی ہے جب آنکھ تجھ پہ اے جانِ بہار
سنگیت کی سرحدوں کو چھُو لیتا ہُوں

اس کی آواز ہے کہ امرت کی پھُوار
وہ رُوپ کہ پیار کی ہو جیسے چُمکار
وہ لوچ ، وہ دھج ، وہ مسکراہٹ ، وہ نگاہ
وہ موجِ نفس کہ سانس لیتی ہے بہار

یہ شعلۂ حُسن جیسے بجتا ہو ستار
ہر خطِّ بدن کی لَو میں مدّھم جھنکار
رنگین نگاہ سے کِھل اُٹھتے ہیں چمن
رس ہونٹوں کا پی کے جھُوم اُٹھتی ہے بہار

موجِ مئے ناب بہکی بہکی سی یہ چال
گھنگھور گھٹائیں بکھرے بکھرے سے یہ بال
چھلکی چھلکی سی جوانی کی یہ شراب
قد ہے کہ بھرا بھرا ہے مینائے جمال

وہ مست نظر کہ موجِ صہبا تھرّائے
وہ ہنستی جبیں کہ صبحِ صادق شرمائے
اِک موجِ حیات نرم گامی تیری
بے حِس راہوں میں جان جیسے پڑ جائے

وہ بکھرے بدن کا مسکرانا ، ہے ہے
اس کے جوبن کا گنگنانا ، ہے ہے
کانوں کی لوؤں کا تھرتھرانا کم کم
چہرے کے تِل کا جگمگانا ، ہے ہے

انگڑائی سے نیند آفتابوں کو بھی آئے
وہ چال کہ ٹھوکر آسمانوں کو لگائے
وہ قد کہ جھنجوڑ کر قیامت کو جگائے
وہ شوخ ادا کہ برق آنکھیں جھپکائے

آواز میں وہ لوچ کہ بُلبل چہکے
رفتار میں وہ موج کہ سبزہ لہکے
زُلفوں سے چمک مانگتی ہے شامِ بہار
عارض میں حِنا کا نرم شُعلہ دہکے

جُوڑے میں سیاہ رات کُنڈلی مارے
ماتھے کے عرق میں جِھلملاتے تارے
عارض میں سحر کے چھلکے چھلکے ساغر
ٹھوڑی میں قمر کے جگمگاتے پارے

جب تاروں بھری رات نے لی انگڑائی
نمناک مناظر نے پلک جھپکائی
جب چھا گئی پُر کیف اُداسی ہر سمت
سرشار فضاؤں کو تری یاد آئی

جب پچھلے پہر پریم کی دُنیا سو لی
کلیوں کی گرہ پہلی کرن نے کھولی
جوبن رس چھلکاتی اُٹھی چنچل نار
رادھا گوکل میں جیسے کھیلے ہولی

کس بادہ سے چوُر ہے جوانی تیری
کن شعلوں کا نوُر ہے جوانی تیری
جیسے جوالا مُکھی ہو پھٹنے والا
کتنی بھرپُور ہے جوانی تیری

ہر سانس میں گلزار سے کھِل جاتے تھے
ہر لمحے میں جنّت کی ہوا کھاتے تھے
کیا تجھ کو محبّت کے وہ ایّام ہیں یاد
جب پردۂ شب بجتے تھے، دِن گاتے تھے

افلاک پہ جب پرچمِ شب لہرایا
ساقی نے بھرا ساغرِ مہ چھلکایا
کچھ سوچ کے کچھ دیر تامُّل کر کے
اُس نے بھی ذرا پردۂ رُخ سرکایا

کِس پیار سے دے رہی ہے میٹھی لوری
ہِلتی ہے سڈول بانہہ گوری گوری
ماتھے پہ سُہاگ، آنکھوں میں رَس، ہاتھوں میں
بچّے کے ہِنڈولے کی چمکتی ڈوری

یہ راز و نیاز یہ سمے خلوت کے
یہ آنکھ میں آنکھ ڈال دینا ترا
ہرنی ہے ڈری ڈری سی اور کچھ مانوس
یہ نرم جھجک ، سپردگی کی یہ ادا

تو ہاتھ کو جب ہاتھ میں لے لیتی ہے
دکھ درد زمانے کے مٹا دیتی ہے
سنسار کے تپتے ہوئے ویرانے میں
سکھ شانت کی گویا تو ہری کھیتی ہے

آنسو سے بھرے بھرے وہ نینا رس کے
ساجن کب اے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات ، یہ برہ کی پیڑا
جس طرح الٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

لہروں میں کِھلا کنول نہائے جیسے
دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ رُوپ، یہ لوچ، یہ ترنّم، یہ نِکھار
بچّہ سوتے میں مُسکرائے جیسے

ہر عِشوہ کا کُچھ بھید بھرم لینے دے
ہر لائے ہُوئے رنگ کو جم لینے دے
اے پریم کی سیج کی رسیلی پُتلی!
اتنا بھی نہ چھیڑ، کُچھ تو دم لینے دے

خاموش لبوں سے گلستاں جھڑتا ہے
دیدہ ہے کہ سَو میکدوں سے لڑتا ہے
اے رشکِ چمن لہلہے جوبن پہ ترے
سَو گلشنوں کا رنگ پھیکا پڑتا ہے

پیغمبرِ عشق ہُوں سمجھ مِرا مقام
صدیوں میں پھر سُنائی دے گا یہ پیام
وہ دیکھ کہ آفتاب سجدے میں گِرے
وہ دیکھ اُٹھے دیوتا بھی کرنے کو سلام

بالوں میں خنک سیاہ رات ڈھلتی
گالوں کی شفق کی اوٹ شمعیں جلتی
تاروں کی سرکتی چھاؤں میں بستر سے
اِک جانِ بہار اُٹھتی ہے آنکھیں مَلتی

معصُومیٔ حسن چھیڑ جائے جس کو
نرمیٔ جمال گدگدائے جس کو
کُچھ پُوچھ نہ ایسی لاجونتی کی حیا
شرماتے ہُوئے بھی شرم آئے جس کو

ہر ایک نظر یہ کام کرتی بھی نہیں
ہر ایک نگاہ یُوں اُترتی بھی نہیں
صدقے ترے دیکھنے کے ظالم دِل پر
پڑتی ہے وہ چوٹ جو اُبھرتی بھی نہیں

دِن ڈُوب گیا رات کی اندھیاری ہے
ہر سمت خموشی کا سماں طاری ہے
تارے نکلے تو درد سینے میں اُٹھا
وہ آنکھ کی، یہ قلب کی بیداری ہے

یہ ولولہ، یہ اُمنگ دریا دریا
یہ شعلۂ بے درنگ صحرا صحرا
یہ پرتوِ انقلاب عالم عالم
یہ جلوۂ انقلاب دُنیا دُنیا

جُز میرے یہ رنگِ حُسن اُچھالے کِس نے
سانچے میں یہ خط و خال ڈھالے کِس نے
سازِ بے نغمہ تھا یہ جسمِ رنگیں
اِس ساز سے یہ بول نِکالے کِس نے

اِنسان کے پیکر میں اُتر آیا ہے ماہ
قد یا چڑھتی ندی ہے اَمرت کی اتھاہ
لہراتے ہُوئے بدن پہ پڑتی ہے جب آنکھ
رس کے ساگر میں ڈُوب جاتی ہے نگاہ

قامت ہے کہ انگڑائیاں لیتی سرگم
ہو رقص میں جیسے رنگ و بُو کا عالم
جگ مگ جگ مگ ہے شبستانِ اِرم
یا قوسِ قزح لچک رہی ہے پیہم

تاروں کی سُہانی چھاؤں، گنگا اشنان
مَوجوں کی جلو میں رنگ و بُو کا طُوفان
انگڑائیاں لے رہی جیسے اُوشا
یہ شانِ جمال، یہ جوانی کا اُٹھان

ساغر کفِ دست میں، صُراحی بہ بغل
کاندھے پہ گیسوؤں کے کالے بادل
یہ مدھ بھری آنکھ، یہ نگاہیں چنچل
ہے پیکرِ نازنیں کہ حافظ کی غزل

موتی کی کان، رس کا ساگر ہے بدن
درپن آکاش کا سراسر ہے بدن
انگڑائی میں راج ہنس تولے ہُوئے پر
یا دُودھ بھرا مان سرُوور ہے بدن

گنگا اشنان ، یہ چمکتے بجرے
ناوؤں میں سوار مہ جبینوں کے پرے
سنگم میں لگا کے غوطہ اُٹھتا ہے یہ کون
موجوں کے بھنور سے جیسے زہرہ ابھرے